عوام سے خوفزدہ جمہوری حکمران

تحریر: سہیل احمد لون

65برس ہوئے برطانوی سامراجیت کا سورج ہمارے خطے سے غروب ہو چکا لیکن اس کی حدت نے کچھ خاندانوں کو ایسا گرما رکھا ہے کہ وہ آج بھی اس برطانوی دھوپ کے مزے پاکستان میں بیٹھ کر لے رہے ہیں۔جن انتخابی حلقوں سے وہ عوام کو بیوقوف بنا کر ووٹ لیتے اور عوام پر مسلط ہوتے ہیں اُن علاقوں سے بعد ازاں اُن کا گزر بھی نہیں ہوتا لیکن برطانیہ کا سرکاری دورہ کرنے میں وہ کسی سے پیچھے رہنا توہین سمجھتے ہیں۔اپنے سیاسی گناہ بخشوانے کے لیے اکثر و بیشتر ملکہ کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیکنے آتے رہتے ہیں۔وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کا اپنی ٹیم کے ہمراہ برطانیہ کے حالیہ سرکاری دورے نے برمنگم پیلس کے حقیقی بادشاہوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے اور تو اور برطانیہ کے مہنگے ترین سٹور کے ملازم ایک دوسرے سے پوچھتے پائے گئے ہیں کہ یہ کونسی شاہی فیملی ہے؟ برمنگھم جانے کا پروگرام شاید اس وجہ سے کینسل کر دیا گیا کیونکہ ان دنوں موسم سرد تھا اور سردیوں میں لوگوں نے جوتے بھی بھاری پہنے ہوتے ہیں...... بھاری جوتے پہن کر استقبال کروانا کافی تھکا دینے والا عمل ہے جس کو ہمارے عوام دوست وزیر اعظم کیسے برداشت کر سکتے تھے۔مقامی میڈیا نے برطانوی وزیر اعظم کی یوسف رضا گیلانی کو پبلک ٹرانسپورٹ کے استعمال کی آفر کو بڑی اہمیت دی۔ڈیوڈ کیمرون سے میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد جب وزرائے اعظم دوپہر کے کھانے کے لیے روانہ ہونے لگے تو سنٹرل لندن میں ٹریفک کے رش سے بچنے کے لیے برطانوی وزیر اعظم نے یوسف رضا گیلانی سے کہا کہ اگر لنچ پر مقررہ وقت پر پہنچنا ہے تو پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کر لیتے ہیں۔جب سرکاری قافلہ رواں دواں ہو تو ملکہ کے دیس میں عوام کو ٹریفک سگنل پر صرف پروٹوکول کیلئے روکنے کی عادت نہیں شاید اسی لیے یہاں کسی بچے کو ٹریفک سگنل پر پیدا ہونے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا۔برطانیہ کے عوامی نمائندے پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرنے میں کوئی ہتک محسوس نہیں کرتے ۔پبلک ٹرانسپورٹ کی آفر کرنے کے بعد برطانوی وزیر اعظم نے مذاقاً یا طنزاً مسکرا کر یہ بھی کہہ دیا کہ پتہ نہیں اپوزیشن والے آپ سے کیا سلوک کریں۔کیونکہ وزیر اعظم کے استقبال کے لیے ایک کثیر تعداد بڑی بے چینی سے باہر ان کا انتظار کر رہی تھی۔یوسف رضا گیلانی نے ڈیوڈ کیمرون کی پیشکش ٹھکرا دی۔اگر وہ عوامی لیڈر ہوتے تو ڈٹ جاتے......مگر ڈرتے نہیں۔عوامی لیڈر کو عوام سے کیسا خوف......؟اگر وہ عوامی لیڈر ہوتے تو وہ ڈیوڈ کیمرون کو وسطی لندن میں کسی عوامی ریسٹورنٹ میں عوام میں بیٹھ کر کھانے کا بھی کہہ سکتے تھے جو تاریخ کا حصہ بن جاتا۔اس کے لیے ہو سکتا ہے ڈیوڈ کیمرون کو سوچنا پڑتا۔ڈیوڈ کیمرون نے مختصر سی ملاقات میں نیٹو سپلائی کا وہ مسئلہ حل کروا لیا جس میں امریکہ بہادر کافی مدت سے کامیاب نہ ہو سکا تھا۔اس کامیابی سے برطانیہ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ سیاست میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔اپنی سیاسی بصیرت سے انہوں نے دنیا پر ایک لمبے عرصے تک حکومت کی ہے اور آج بھی ان کے آشیر باد کے بغیر امریکہ کچھ نہیں کر سکتا۔بعض اوقات کسی لیڈر کا ایک عمل اس کو تاریخ کا حصہ بنا دیتا ہے اور اکثر اوقات ایک عمل تاریخ میں ولن بنا دیتا ہے۔اچھے لیڈر میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ تاریخ بناتا ہے۔یوسف رضا گیلانی کا تعلق جس پارٹی سے ہے اس کے بانی ذوالفقار علی بھٹو ملکی اور بین الاقوامی

شہرت کے حامل تھے جن میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ معمولی عمل سے غیر معمولی نتیجہ حاصل کر لیتے تھے۔ 70ء کے اوائل میں بھکر روڈ جھنگ میں ایک لمبی سیاہ کار ایک بس اسٹاپ پر رکی اس میں سے ایک شخص باہر نکلا اور تیز دھوپ میں شیشم کے درخت کے نیچے ایک نائی جو پیڑ کے تنے کے ساتھ شیشہ باندھ کر حجام کا کام کر رہا تھا اس سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ غریب حجام اپنے سامنے ذوالفقار علی بھٹو کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اس کا حال احوال پوچھ کر پھر سیاہ کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا مگر اس کے بعد سارے گاؤں والوں میں وہ حجام اتنا مقبول ہو گیا کہ لوگ اس کی زبانی سارا واقعہ سننے کے لیے اس کے پاس آ کر بال کٹواتے۔ چند دنوں میں حجام شیشم کے پیڑ سے ایک دکان تک ترقی کر گیا جس کی دیواروں کو اس نے پیپلز پارٹی کے جھنڈوں اور ذوالفقار علی بھٹو شہید کی تصویروں سے سجا دیا۔ مرتے دم تک اس نے بھٹو کے ہاتھ ملانے پر اس سے وفا کی، قومی سطح پر ایسے بے شمار واقعات ہیں جس سے بھٹو عوامی لیڈر بنا مگر 14 دسمبر 1971ء کو اقوام متحدہ میں سلامتی کونسل کے سامنے دھواں دار تقریر نے بھٹو کو چند لمحوں میں بین الاقوامی لیڈر بنا دیا۔ لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد کر کے امریکہ سے برطانیہ تک خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ اپنے موقف پر ڈٹ گیا...... جان دے دی مگر گھٹنے نہیں ٹیکے۔ آج اس کی پارٹی کے رہنما پیپلز پارٹی کا جھنڈا تو ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں ایوان میں پارٹی کے بانی کی تصویر بھی لگا رکھی ہے۔ کچھ تو بینظیر بھٹو کی تصویر کو بھی سیاسی نسخے کے طور پر ہر جگہ بغل میں لیے دبائے نظر آتے ہیں لیکن عمل میں اس پارٹی کے بانی سے کوئی مماثلت نہیں۔ موجودہ سیاسی اکابرین جمہوریت کا راگ تو الاپتے نہیں تھکتے مگر یہ کہاں کی جمہوریت جہاں لیڈر عوام میں آنے سے خوف کھائے۔ جو لیڈر اپنے ملک میں عوام کے درمیان آنے کی جرات نہیں کر سکتا وہ بھلا برطانیہ میں کیسے عوام کا سامنا کر سکتا ہے جہاں حقیقی جمہوریت ہے، جو عوام کو ''جراتِ آزادی اظہار'' اور اعتماد بخشتی ہے۔ جہاں عوام کے آگے سیاسی لیڈر جواب دہ ہوتے ہیں، جہاں ان کا مقصد عوام کی خدمت کرنا ہوتا ہے عوام پر حکومت کرنا نہیں۔ یہ کیسے عوامی لیڈر ہیں جو عوام کو مشکلات کے دوزخ کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتے......؟ جنھوں نے اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو کر اپنے ضمیر کو بے دردی سے روند ڈالا ہے۔ اخلاقی جرات کو بے حسی اور بے غیرتی کے قبرستان میں دفن کر دیا ہے، یہ سیاسی ڈریکولا غریب عوام کا خون چوسنے کے لیے باری باری مسلط ہوتے رہتے ہیں۔ محترمہ بینظیر بھٹو شہید نے جمہوریت کو سب سے بڑا انتقام کہا تھا مگر آج اسی جمہوریت سے ایسا انتقام لیا جا رہا ہے کہ لوگ مارشل لاء کو پھر سے یاد کرنا شروع ہو گئے ہیں۔ اگر ملک میں حقیقی جمہوریت ہو تو لیڈر عوامی ہوتا ہے جسے عوام سے کوئی ڈر نہیں ہوتا بلکہ وہ ملکی اور قومی مفاد کے خاطر بین الاقوامی طاقتوں کے سامنے ڈٹ جاتا ہے۔ احمدی نژاد اس کی زندہ مثال ہے جو عوامی طاقت کے بل بوتے پر بڑی طاقتوں کے آگے ڈٹا ہوا ہے۔ اچھے لیڈر کو اپنا آپ منوانے کے لیے صرف ایک موقع ہی کافی ہوتا ہے مگر موجودہ سیاسی رہنماؤں کو بار بار موقع ملا پھر بھی اپنے آپ کو لیڈر ثابت کرنے میں ناکام رہے۔ عزت، شہرت اور دولت عطیہ خداوندی ہے جو ہر کسی کو ایک ساتھ نصیب نہیں ہوتا۔ عزت وہ ہے جو کوئی بغیر کسی خوف، غرض، لالچ اور طمع کے کی جائے، شہرت...... اچھے، مثبت اور مثالی کام سے ہونا ضروری ہے، دولت...... حرام اور ناجائز طریق سے کمائی ہوئی انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ ہمارے سیاسی اکابرین کے پاس بھی اگر جائز طریقے سے کمائی ہوئی حلال دولت ہوتی، عوام کی عزت کی ہوتی تو ان کی حکمرانوں کی عزت بھی ہوتی جو عوام بے توقیر ہو اُس کے حکمرانوں کی کیسی عزت، کرپشن کی بجائے اچھے کام میں مثبت شہرت ہوتی تو پاکستان، برطانیہ یا کسی

بھی ملک میں ان کو عوام میں آنے سے خوف محسوس نہ ہوتا۔

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔ سرے

sohailloun@gmail.com

24-05-2012